ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.4 No.4 2021

جیلانی کامران کی نظموں کا کرداری تشخص

Dr Rizwana Naqvi
Lecturer in urdu, GACW Jalal pur sharif Jhelum

Abstract:

In modern Urdu literature Jeelani Kamran's name is not necessitous of introduction. He was a renowed poet and critic of new poetic era who wrote about thirty five books comprising poems and criticism. He was a forerunner for the new age of poetry. His book "Ustanzy" provides the way to understand the "New poetry movement"and its prospect.His art is the other name of love and hope ,after Iqbal he tried to introduce the conjugate ideology of art by his poems.Confidence,personalism,erudition and inveteracy are the most pronounced characteristics of his poems.In most of his poems he has presented his ideology by his characters. In his poetic art it comes in front with multifarious countenance and with the support of these characters Jeelani Kamran longs for the Islamic renaissance. In his poems with his art, characters and conception he proffers the glory and wroth of Islamic past in a new way. His poems try to nourish the doctrinal and cultural harmony and secularisim. His characters are the symbol of thewy and humanism, they provide the light of hope and warmth of love in the aberrance society,If we hold their hands so the darkness of desperation, abortiveness can be volatile.

Key words: Elevation of Adam , Sublunar, Humanity, pursuit, Past and Future, Personalism, Appetency of life, Heaven.

جیلانی کامران اردو نظم کا اہم حوالہ ہیں۔ان کی شعری کاوش "استانزے" نا صرف "نئی شاعری کی تحریک" بلکہ اس تحریک کے باہر بھی جدید شعری اثر و نفوذ اور تغیر و تبدل کا سلسلہ دراز کرتی ہے۔ نئی شاعری کا نام ردّ و انحراف کے حوالے سے نمایاں تر ہے۔ لیکن جیلانی کامران کے ہاں اس ردّ و انحراف میں بغاوت اور توڑ پھوڑ سے زیادہ نئی تخلیق اور نئی آبیاری کی خواہش فراواں ہے۔ "استانزے" جدید بلکہ نئی شاعری کے لیے سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔اس کے دیباچے میں انھوں نے نئی شاعری کے لیے نئی لغت کا مطالبہ کیا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک اب تک کی شعری مساعی میں مستعمل زبان ایک مخصوص طرزِ بیان کی حامل رہی ہے جو مختلف ترکیبوں، استعاروں، محاورات، الفاظ کی بندشوں اور دیگر لسانی جزئیات کا محض عہد بہ عہد اعادہ ہے۔ یہ وہی طرزِ ادا ہے جو ایک طویل عرصے سے مسلسل ادب و شعر میں مستعمل ہے۔ جس کے متواتر استعمال سے ذہن و قلب دونوں جھنجھلا چکے ہیں۔ یہی زبان شاعر لکھتا ہے۔ یہی زبان ادب میں بکھری ہے اور اسی زبان کو لوگ جانتے پہچانتے ہیں۔ یہ صورتِحال زبان کے سکہ بند ہونے کے بعد کی کیفیت ہے۔ جیلانی کامران کے مطابق: سکہ بند زبان پھر بھی کچھ کہہ سکتی ہے مگر زیرِ بحث زبان کا کہنا پہلے سے ادبی آب و ہوا میں موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ اس زبان کو سن کر کچھ محسوس نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسا سننا پہلے ہی سنا جا چکا ہوتا ہے۔ لہٰذا شاعر اور شاعری مردہ لفظوں کا تابوت اُٹھائے ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ مگر نہ تو مردہ لفظوں میں جان پڑتی اور نہ ہی شعرا کے راستے بدلنے سے کوئی خوشگواریت پیدا ہوتی ہے۔" چنانچہ جیلانی کامران نے اپنی شاعری میں اس فرسودگی سے نجات حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اور اس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں

موضوع اور بیان ہر حوالے سے ان کے ہاں تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ نئی شاعری کی جس تحریک سے وہ وابستہ تھے اس کے مسائل و موضوعات ہمارے اردگرد پھیلی زندگی سے سر اُٹھاتے ہیں اور مجموعی طور پر دیکھا جائے تو نئی شاعری کا محور "انسان کی تلاش و شناخت اور اس کی بقا ہے" اور ہر سوال اسی بنیاد سے جنم لیتا ہے جیلانی کامران کو اس حوالے سے یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کے ہاں فکر و فن کے حوالے سے مربوط فلسفہ ملتا ہے۔ وہ حیات و کائنات اور بشر کے حوالے سے دیگر شعرا کے برعکس زمانے کو ردّ نہیں کرتے بلکہ حال، ماضی اور مستقبل کے سنگم پر عروجِ آدم خاکی کے سہانے خواب دیکھتے ہیں اور انسانی معراج کے تمنائی ہیں۔ ان کا یہ فکر و فلسفہ مختصر نظموں سے بڑھ کر طویل نظموں کا خاصا ہے۔ اور ان طویل نظموں میں ان کے فکر و فن کی وضاحت کردار نگاری میں بھرپور انداز سے نظر آتی بلکہ اگر کہا جائے کہ ان نظموں میں کردار نگاری کا فن قدیم و جدید شعرا سے زیادہ کامیاب ہے تو غلط نہ ہو گا۔ جیلانی کامران کی تخلیقی دُنیا در حقیقت باغِ بہشت کی تمنّا ہے اور اس تمنّا کے حصول کی مسافت میں بشر کائنات میں جس جس کردار کے حوالے اور واسطے سے سامنے آتا ہے۔ اس کی عکاسی ان کی نظموں میں بخوبی ملتی ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر ضیاء الحسن کا بیان اہم ہے:

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

بہشت کی دنیا ان کی عینی و آدرشی دنیا ہے۔ وہ ہماری دنیا کو بھی بہشت صورت دیکھنا چاہتے"
ہیں۔ بہشت ان کے نزدیک ایسی دنیا ہے جو شرّ سے پاک اور خیر کا گہوارا ہے جہاں حسن اور
"(تخلیق ہے جہاں امن، سکون اور محبت ہے۔۔(۱

جیلانی کامران کی طویل نظم "باغ دنیا" اسی بہشت کا تخلیقی خاکہ ہے اس نظم میں چار کردار (۱) محبوب (۲) ابلیس (۳) ملائکہ (۴) انسان، اور چار شہر (۱) شہر محبوب (۲) شہر جدائی (۳) شہر شرّ اور (۴) شہر وفا ہیں۔ اور ان کے ساتھ چار ہی کیفیات فرقت، سفر، قیام اور تمنّا ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو یہ تمام کا تمام قصّہ انہی دو کرداروں اور ان کی زمین پر مراجعت سے ماخوذ ہے جنھیں آدم اور حوّا کا نام دیا جاتا ہے۔ جن کا ٹھکانہ وہ بہشتِ بریں تھا جس سے انہیں نکل جانے کا حکم ہوا تھا۔ گو کہ یہ دونوں کردار دنیا کی آبادکاری کے منبع، مصدر اور جنتِ ارضی کے مالک ہیں مگر بباطن ان کے دل کی دھڑکن اسی کھوئی ہوئی بہشت کی آرزو میں بے چین و بے قرار ہے۔ چنانچہ انہی کرداروں کی یہ نرالی کہانی بار بار خود کو دہراتی ہے۔ انسان اس دنیاوی گورکھ دھندے اس چکرویو سے نکل کر اپنے مقام ابدی کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اپنی منزل پانا چاہتا ہے مگر اسے راستہ نہیں ملتا۔۔۔ ایسے میں وہ شعر کہتا ہے، فلسفے تراشتا ہے نئے نئے نظام وضع کرتا ہے کہ اس دائرے سے نکل سکے لیکن دیکھتا ہے تو خود کو پھر اسی دائرے میں چکراتا ہوا پاتا ہے۔ جیلانی کامران کی بیشتر نظموں کے کردار اسی جستجو میں مگن نظر آتے ہیں اور بالخصوص "باغِ دنیا" میں یہ کہانی زیادہ مربوط فکری انداز کی حامل ہے۔ نظم کی ابتدا روشن اور شاداب مستقبل کی بشارت سے ہوتی ہے اور پھر انسانی تہذیب و تمدن کا پورا سفر اسی نظم میں طے ہوتا ہے جہاں انسان کہیں مہربان کی صورت نظر آتا ہے تو کہیں شیطان کی۔ وہ بہک چکا ہے، بے راہ روی کا شکار ہے، خرابیوں، کجیوں، کوتاہیوں کا شکار ہے۔ اس کے پاس کوئی نصب العین نہیں ہے ایسے میں لایعنیت اور بے وقعتی کے اندھیرے اسے نگلے چلے جا رہے ہیں۔ نسل در نسل بھوک، دکھ، ظلم و جور اور لاحاصلی کا زہر رگوں میں اتر چکا ہے۔

باغ دنیا سے گزرتی ہے صدا آلِ آدم کے سسکنے کی تڑپنے کی صدا"
(اپنے ہر شہر میں گم راہ بھٹکنے کی صدا رقص بسمل کی صدا خیمہ در خیمہ غمِ دوست کی مجلس کی صدا"(۲

جیلانی کامران کی نظموں میں پرندوں کو انسانی معاونت، رہبری اور رفاقت کا جو منصب حاصل ہے اس کا ظہور یہاں کبوتر کی صورت نظر آتا ہے۔ یہ کردار دانشمندی کی اس روایت کی توسیع ہے جس کے نقوش ہمیں داستانوی روایات میں جابجا ملتے ہیں کبوتر انسان سے مخاطب ہو کر اس کے زوال اور درد و غم کی وجوہات بیان کر کے اسے انا، طمع اور ہوس کی دیوار چاٹنے کی طرف مائل کرتا ہے۔

یہ سن کر"
کبوتر نے اس سے کہا ایسی دنیا میں
جس کے مکیں آب و دانے کی خواہش
میں اڑتے پرندوں کو پنجروں میں
آزاد لوگوں کو زنداں میں
انسان کو اقدار و ہوس کی سلاخوں میں
آباد کرتے ہیں، اُن کے لیے
کوئی قسمت سنورتی نہیں۔۔۔
آسمانوں سے کوئی بھی برکت اترتی نہیں
(سواری فرشتوں کی اس راستے سے گزرتی نہیں!۔۔۔(۳

سو اس دور کربناک میں کہ جہاں طاقت و ہوس کے نشے میں انسان گمراہ ہو چکا ہے راہ نجات، فقط اس کھوئی ہوئی منزل کی جستجو ہے جو معراج انسانیت ہے۔ اس سفر میں انصاف، علم اور جذبہء عشق وہ ہتھیار ہیں جو انسان کو اس کی منزل تک پہنچا سکتے ہیں۔ اس نظم کا سب سے اہم کردار "احیا" ہے۔ جو شر کے مقابل خیر کی قوت اور جیلانی کامران کا آدرشی

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

کردار ہے۔ نظم کی چھ منازل میں سے "احیا" منزلِ آخر یعنی منزلِ تمام جو معاصر دور ہے، اس میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے ظہور کا مقام شہر قُم، جبکہ وقت ظہور صبح کی نماز کے بعد دعا ہے۔ یہاں جیلانی کامران کا مقصد بشر کو یہ بتانا ہے کہ انسانی کوشش اور دعا تسخیر کائنات کا سب سے بڑا راز ہے جو دورِ جدید کے دکھوں کا درماں بھی ہے۔ احیا کے پس منظر میں انقلاب ایران کی دھمک بخوبی سنائی دیتی ہے اس لیے احیا بصورت کردار شہر میں اترتی ہے اور مرشدِ قُمؒ کی مہمان بنتی ہے اس کردار کے جو پہلو اور خصوصیات جیلانی کامران نے متعین کیے ہیں ان کی ایک جھلک دیکھیے:-

احیا وقت کی آواز پہ موجود صدا ہے"

!احیا رخت کے پردے میں گزرتی ہوئی نسلوں کی دُعا ہے

اہلِ باطن نے کہا۔۔۔

احیا لیلائے موجود ہے

احیا دشتِ دل و جان کی مشہود ہے

(احیا شاہد و مشہود ہے!۔۔۔۔(۴

احیا جو خیر کی پیامبر اور خیر کی صورت ہے، اہلِ شرّ یعنی آلِ ابلیس کی حکمرانی کے لیے تباہی کا پیغام ہے۔ وہ اس کے قدموں کی بڑھتی ہوئی رفتار اور اس کی فتوحات کی گھن گرج سے خوفزدہ ہیں۔ ان کا حال ہی نہیں مستقبل بھی احیا کے وجود کے باعث بھیانکی سے دوچار ہے۔ ایسے میں آلِ ابلیس بہر صورت احیا کی راہ روکنے اور اسے ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ احیا کا مسکن چونکہ شہر قُمّ ہے چنانچہ وہ اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے شہر قمؒ کو ملیامیٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ناکام رہتے ہیں کیونکہ احیا کا وجود جس روشنی، خوشحالی، تابندگی، تسکین اور شادابی کا مظہر ہے۔ اس کی شعاعوں کے آگے بند باندھنا ممکن نہیں لوگ جان چکے ہیں کی احیا ہی وہ ہستی ہے جو ان کے امن و سکون اور خوشی و خوشحالی کی ضامن ہے۔

جاگ! بیمار زمین"

جاگ بیمار پریشان زمیں

جاگ اور دیکھ بہار

جاگ اور دیکھ درختوں میں پرندوں کی بہار

" (دیکھ پھولوں کی قطار(۵

نظم کا کمال یہ ہے کی جیلانی کامران نے اس نظم کی ابتدا جس روشنی و تابناکی سے کی ہے اس کی انتہا بھی اسی درخشانی پہ کی ہے۔ انھوں نے اس نظم کو جس نقطے سے شروع کیا تھا زمینی تہذیب و تمدن کی پوری داستان رقم کرنے کے بعد اس کی انتہا نہایت منطقی انداز میں اسی نقطے پہ کی ہے اور کردار نگاری کے وسیلے سے نا صرف انسانیت کے عروج و زوال، خوشحالی و بدحالی کی داستان کہی ہے۔ بلکہ ان کا فلسفہء فن جو ہمیشہ ایک روشن مستقبل کا تمنائی ہے اس کا اظہار بھی نہایت خوبی سے ہوا ہے۔

جیلانی کامران کی نظم "نقشِ کفِ پا" نظم نگاری میں کردار نگاری کے حوالے سے ایک منفرد تجربہ ہے۔ لیکن ڈرامائی انداز تحریر ہونے کے باوجود وہ اس نظم کو ڈرامہ تسلیم نہیں کرتے انہوں نے "نقش کف پا" کو ڈرامائی نظم کہنے کی بجائے لمبی نظم کے نام سے پکارنا مناسب سمجھا ہے۔ ان کے مطابق یہ رعایت جذباتی نہیں ہے بلکہ میں نے جان بوجھ کر ڈرامائی ترکیب کو استعمال کرنے سے احتراز کیا ہے کیونکہ ڈرامائی کے ساتھ ہمارا ذہن ڈرامے اور ڈرامے کے اسٹیج اور اداکاری کی طرف چلا جاتا ہے اور اس طرح ایک ڈرامائی نظم شاعری کی حدود سے نکل کر ایسے فن کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے جس کا شاعری سے بہت کم تعلق ہے(۶)۔ مغربی طرزِ ادا کی حامل یہ نظم مغربی قالب اور عجمی روح رکھتی ہے خود جیلانی کامران کا بیان ہے: "جہاں تک فارم اور ہیئت کا تعلق ہے "نقش کفِ پا" کا عجمی شعری روایت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ اسے جس انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ عجمی شعری روایت کا انداز نہیں ہے۔ اس لیے "نقش کفِ پا" کی اگر کوئی قیمت ہے تو وہ یورپی شعری روایت کے حوالے سے جانچی جا سکتی ہے اور یورپی علم الشعر کے معیاروں کے بغیر "نقش کف پا" کو اچھا یا برا کہنا بھی ایک طرح کی بے انصافی ہو گی۔ نقش کفِ پا کی فارم غیر عجمی اور غیر مانوس ہے تو مجھے یہ کہنے میں

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ہچکچاہٹ نہیں ہے کہ اس نظم کا نفسِ مضمون عجمی ہے۔(۷)ان کے مطابق یہ نفس مضمون اسی تہذیبی ورثے سے متعلق ہے جس کے ساتھ ہماری تہذیبی وادبی روایت کا رشتہ نہایت گہرا ہے اور یہ رشتہ ایسا ہے کہ جسے ہم اپنے لہو اور لہجے میں برابر محسوس کرتے ہیں۔یورپی روایت اور فکری اثرات کے باوجود نقش کف پا کا ضمیر عجمی اسلامی تہذیب کا ضمیر ہے۔لیکن اس نظم کے بارے میں بیشتر ناقدین کا خیال ہے کہ یہ نظم ایک منظوم ڈرامہ ہے۔ڈاکٹر وحید قریشی کا کہنا ہے-:"یہ نظم ایک منظوم ڈرامہ ہے جس کے کردار علامتی ہیں۔دراصل یہ پاکستان کے ایک ذہین فرد کی ذہنی کشمکش کا ایک تمثیلی اظہار ہے۔یہ عذابِ دانشِ حاضر ہے جس سے پوری کی پوری قوم گزر رہی ہے۔یہ ہم سب کی المناک داستان ہے۔(۸) ڈاکٹر وحید قریشی اور کچھ دیگر ناقدین کے نزدیک "نقشِ کف پا"طویل نظم نہیں بلکہ منظوم ڈرامہ ہے۔چنانچہ اس حوالے سے جیلانی کامران کی وضاحت قابلِ قبول ہونے کے باوجود وضاحت تشریح طلب ہے۔کیونکہ ڈرامہ آج جس منزل پر آچکا ہے وہاں زندہ کرداروں کا وہ مخصوص رنگ بھی باقی نہیں رہا جسے جیلانی کامران ڈرامے کا ضروری حصہ قرار دیتے ہیں۔اس گریز کا سبب غالباً یہ ہو سکتا ہے کہ کہیں اس نظم کو ڈرامہ جان کر قاری اسٹیج اور اس کے لوازمات کا تقاضا نہ کر بیٹھے۔ڈرامے اور نظم کی بحث سے قطع نظر یہ طویل نظم پانچ کرداروں پر مشتمل ہے۔(۱) ایک قیدی(۲)لڑکا(۳)عورت(۴) سایہ(۵)مصنف،اور ان کے ساتھ ساتھ یونانی ڈراموں کی طرز پر اندھے اور بوڑھے درویشوں کے کورس جاری رہتے ہیں۔یعنی یہ لوگ بھی طویل نظم کے ارتقا اور انجام کا ناگزیر حصہ کہے جاسکتے ہیں۔

نظم کا بنیادی کردار قیدی جو اپنے نام میں ہی معنویت سموئے ہوئے ہیں۔یہ بشر زمیں کا قیدی ہے یہاں آسمان کا ذکر نہیں کیونکہ ساری باتیں زمین کی باتیں ہیں۔(۹)چنانچہ یہ دنیا جس کی قید میں اس کے شب وروز اندھیر ہیں،اس کے لیے بیگانگی اور اجنبیت کا دوسرا نام ہے مگر اس قید کا تقاضا ہے کہ وہ ماحول کے کرب سے آشنا ہو سو قیدی ہر لمحہ درد و کرب کی کڑیوں میں جکڑا تکلیف دہ زندگی سے نبرد آزما ہے۔وہ زمانے کے تیور پہچانتا ہے اور اس کے تقاضوں سے آگاہ بھی ہے مگر وہ اس طرزِ حیات پر چلنے سے قاصر ہے جو باقی لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے چنانچہ وہ ہر لمحہ کربِ زیست کا اذیت ناک بوجھ اپنے کندھوں پر لادے۔۔۔ محوِ سفر ہے اور اس سفر میں اندھے مردوں کا کورس اس کا ہمراہی ہے۔

قیدی:موت اور عمر کا دل سرد ہے،جینا مرنا"

مر کے جی اٹھنا یا مر جانا رستے کا عذاب

(خاک اور جسم کی تقدیر بنانا۔۔۔!ظالم"(10

ڈرامے کا محور قیدی ہی ہے جو زیست کی المناکی حال کے زوال اور ہمتوں کے سرد ہونے کا نوحہ کہتا ہے۔ڈاکٹر وحید قریشی کے بقول:قیدی اس ڈرامے کا بنیادی علامتی کردار کوئی ضمنی اور ذیلی EGO ہے۔گزشتہ تمدنی روایت اور شہری زندگی کی بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کے درمیان خلائی سفر اس ڈرامے کا ضروری موضوع ہے۔لکھنے والے نے اپنی حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔اندھے مردوں کا کورس بھی قیدی کی زندگی کے ایک رخ کا استعارہ ہے جہاں صنعتی زندگی کی کشاکش انسان کو انسانی اقدار سے غافل ہو کر مشینی عمل اور جسمانی تقاضوں کا اسیر کر دیتی ہے۔قیدی اور اندھے مرد ایک ہی کرب اور ایک ہی امید شکنی کا شکار ہیں اور اپنے ماحول کی حوصلہ شکن میکانکیت کے خلاف بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔(۱۱)قیدی کے اس کردار کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ حقائق سے فرار کی بجائے حقیقتوں کو جھیلنے پہ آمادہ نظر آتا ہے۔اور اکیلے پن کے بعد جب اسے اندھے مردوں کا ساتھ میسر آتا ہے تو یہ کردار یکسر تبدیل ہو جاتا ہے اور کرداروں کی یہ ثنویت دو حقیقتوں کو جنم دیتی ہے۔جو ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں اور مایوسی کا وہ سفر جو نظم کی ابتدا سے شروع ہوتا ہے۔بڑھتے ہوئے ہر قدم کے ساتھ حوصلے اور ہمت کی مسافرت میں ڈھل جاتا ہے۔

اے کاش!میں بادل ہوتا،"

بحر کی موج کی آغوش میں گرتا،قطرے

(میرے کہنے سے سمندر کے بدن پہ گرتے۔۔۔وہ گہر بنتے،میں قسمت بنتا!"(12

یہ نظم جہاں مشینی دور کی کشاکش،بے لذتی،بدہیئتی اور مایوسی کا استعارہ ہے،وہیں اگر اس نظم کو ملکی ماحول کے تناظر میں دیکھا جائے تو نقشِ کف پا کا قیدی ہماری اجتماعی زیست کا وہ آئینہ ہے جس میں ابھرنے والا عکس جسم سے روح تک زخمی اور داغ دار ہے۔قیدی جو جبر کی جکڑن میں بھی صدائے احتجاج بلند کرتا اس فرد کی نمائندگی کرتا ہے جو اگرچہ جبر وذلت کو سہہ تو رہا ہے(کیونکہ جبر کے مقابل وہ کمزور ہے)مگر خاموشی سے نہیں۔وہ بے حس،جاہل اور بے روح کردار نہیں ہے بلکہ پابند سلاسل زندہ حقیقت ہے جبھی بار بار اس

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

کی پکار ادارک کے دروا کرتی قاری کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اور بصارت اور بصیرت کی تہیں بے امان زندگی کی گرد تلے تڑپ تڑپ کے کھلنے لگتی ہیں۔ زیست اور حاصل زیست سے جڑے ان گنت سوالات سر پٹکتے ہیں اور تہی دستی کے عذاب سے جوجتے بے بسی کے ہاتھوں مجبور ہو جاتے ہیں۔

(عمر کیا چیز ہے؟ غم کیا ہے؟ یہ موسم جس کا تذکرہ وقت کی تاکید ہے کیا ہے؟ میرا ماجرا کیا ہے؟۔"(13"

اور قیدی کا ماجرا در حقیقت اس دور کے انسان کا ماجرا ہے۔ جو اکیلا ہے۔ موت کا کھیل ہر لحظہ جاری ہے کبھی جنگوں کی صورت تو کبھی امن و سلامتی کے خواہاں انسانوں پر بمباری کی صورت۔ زمین پر انسان اپنا خود سے بڑا عکس تراشنے کی کوشش میں ظالم و جابر بن چکا ہے۔ موت کے یقینی اور بے یقینی حملے جغرافیائی حد بندیوں، صنعتی پروگراموں اور تلاش روزگار کے ہنگاموں میں ایسے نازل ہوتے ہیں جیسے آسمانوں سے برق گرتی ہے۔ اور پھر گہرے بادلوں میں چھپ جاتی ہے ایسے میں حیاتِ انسانی کا مقدر فنا ہے یا پھر دائمی کرب۔ قیدی کا کردار اسی دائمی کرب کا نمائندہ ہے مگر جیلانی کامران کا آدرش انسان کی شکست کو قبول نہیں کرتا بلکہ اسے اس سفر کی طرف گامزن رکھتا ہے کہ جو بالآخر اسے منزل تمام تک پہنچائے گا کہ جہاں سے اس نے آغازِ سفر کیا تھا۔ جبھی اندھے، بے بصیرت اور بے روح ہجوم کے مقابل اس کا وجود رہنمائی، ہمت اور حوصلے کا نشان ہے کہ جو حقائق کو دیکھنے اور پرکھنے کا حوصلہ ہی نہیں رکھتے جن کے لیے زندگی محض ایک دائروی گردش ہے، زمانے کا کرب زمانے کا انقلاب ان کے لیے کسی تبدیلی کا شاخسانہ تھا، نہ ہے۔ نظم کے یہ دو کردار ہمارے معاشرے میں جابجا نظر آتے ہیں بلکہ اگر کہا جائے کہ سارا معاشرہ انہی دو کرداروں کا عکاس ہے تو غلط نہ ہو گا۔ ایک طرف صاحب دل اور جہد پیہم کے تمنائی لوگ اور دوسری طرف زندگی کی صعوبت کو مقدر سمجھ کر قبولنے والے لوگ کہ جنھیں زندگی کی لذتوں، مسرتوں، امن و سکون اور خوشحالی و ترقی سے کوئی سروکار نہیں بلکہ وہ تو ان منازل تک پہنچنے کا حوصلہ ہی نہیں رکھتے۔ ان کی قوتیں فقدان استعمال سے سلب ہو چکی ہیں اور ادارک، سوچ و پرکھ کے فراق میں اندھا ہو چکا ہے۔ لہٰذا نا صرف آنکھوں کی بلکہ قلب و نظر کی تیرگی بھی ان کا مقدر ہے اور انھوں نے اس مقدر کو بخوشی قبول کر لیا ہے۔

قیدی جو امید و رجا کی علامت ہے ان حالات پر کڑھتا ہے۔ اسے ہر طرف جہل و رجعت کی آندھیاں چلتی محسوس ہوتی ہیں اور اس کے درد و کرب کو شدید تر کرتی چلی جاتی ہیں۔ مگر وہ شمع امید اور احساس رجا کو ختم نہیں ہونے دیتا۔ اور اس کا یہی جذبہ بالآخر احساس و بصیرت سے عاری اندھوں کو راہ روشن کی طرف مائل کرتا ہے، جہل کے مقابل نور اور لایعنیت کے مقابل احساس جیت جاتا ہے اور ہمیں اندھے سجدے میں گرتے دکھائی پڑتے ہیں۔ اندھیرے اور اجالے کے اس معرکے میں بالآخر جیت روشنی کی ہوتی ہے۔ معاشرتی استنباط کے ساتھ ساتھ اگر اس نظم کو جیلانی کامران کے نظریہء فن کے حوالے سے پرکھا جائے تو ان کے فن کا منتہا بھی باطل پہ حق، اندھیرے پہ روشنی اور مایوسی پہ حوصلے کی جیت ہی ہے۔ فنکار اپنے زمانے کے اندھے پن سے غیر مطمئن اور بے چین ہے وہ اپنے لوگوں کے لیے بصیرت اور بصارت کا تمنائی ہے۔ لیکن اندھیرا بہت گہرا ہے۔ مگر شاعر شمع امید کی لو ختم نہیں ہونے دیتا بلکہ اسے اپنے خون جگر سے سینچتا ہے اور بالآخر اس کے ایمان و یقین کی طاقت کربناک اور ابتر صورت حال کو بدل دیتی ہے اور ظلمت نور میں ڈھل کر اک نئی تابندہ صبح کا پیغام بن جاتی ہے۔

!کورس: رک جا"

سرو کا پیڑ کہاں ہے؟ کہاں کا صدمہ

تیری یادداشت کی تحریر ہے، ہم سے کہہ دے

ہم فقط آنکھ کے اندھے ہیں مگر ہم اپنے

(کان سے وقت کو سن سکتے ہیں!"(14

نظم کا اگلا اہم کردار لڑکا ہے۔ یہ کردار شاعر کے مذہبی تصورات کا عکاس ہے اور ماضی، حال اور مستقبل کا سنگم ہے۔ جو تمام کرداروں کے لیے مہمیز بھی ہے۔ یہ کردار حقیقی سے زیادہ رومانی اور خیر کی ایک ایسی متحرک قوت ہے۔ جو روشنی اور ہدایت کی نمائندہ ہے اس سے دوری کربناک اور اس کی قربت ہی کامیابی ہے۔ گردشِ پیہم اس کی شناخت بھی ہے اور تقدیر بھی۔ حرص و ہوا کی اس دنیا میں اسکا وجود قناعت کی علامت ہے۔ وہ حقائق و اسرار کے پردے چیرتا ہے اور راہیں سمجھتا ہے۔

لڑکا! تم مری بات سمجھتے ہو، مگر تم اپنے"

ذہن کی بھوک سے مجبور ہو، جیسے قیدی

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

جو مرے جسم کا اک روپ ہے، اپنے عالم
اپنی تقدیر سے مجبور ہے، محکوم ہے، اس کی آنکھیں
زیست کے علم سے محروم ہیں، ایسے تم بھی
(راہ کے علم سے محروم ہو، ایسا صدمہ"(15

چنانچہ اس درویش صفت لڑکے کی پیروی میں انسانیت کا قافلہ اس منزل کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ جو ہزار ہا صعوبتوں کو سہنے، تلخیوں کو جھیلنے اور ذلتوں کو سمیٹنے کے بعد معراج و آشتی کی صورت اس کی منتظر ہے۔ چنانچہ اس درویش صفت لڑکے کا کردار شرف انسانیت اور بخت خفتہ کی بیداری کا سامان بنتا ہے اور نظم اپنے اختتامی مراحل میں داخل ہوتی ہے۔ اور لڑکا سرووریت کے اسرار سے بندھی اپنی شناخت آشکار کرتا ہے۔ کہ جہاں کل سے آج تک، زمین سے زماں تک اسی کی ذات محیط ہے! اس مقام پر لڑکا انسانی روح و باطن کا نمائندہ ہے جو ہر بشر کے وجود میں موجزن بے قرار بھی ہے اور صاحب قرار بھی۔ نظم کا اختتامی سفر عورت کے سائے کے ساتھ پایہء تکمیل کو پہنچتا ہے۔ تصویر کائنات کا یہ رنگ ماحول و منظر نامے کی تبدیلی کا محرک بن جاتا ہے اور نظم کے تمام کردار بخیر انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ مصنف اس مقام پر نمودار ہو کر انقلاباتِ زمانہ کا نوحہ کہتا ہے اور تابناک مستقبل کی جھلک کو دعا میں ڈھال کر ابتدا تا انتہا نظم کے سارے تانے بانے کو تکمیل کے مراحل تک پہنچاتا ہے۔ یہ کردار اگرچہ مختصر ہے اور نظم کے اختتامی مراحل میں نظر آتا ہے مگر نظم کا سارا سلسلہ اور معنویت کا دارومدار اس کردار سے وابستہ ہے۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کردار کے بغیر گویا نظم اور اس کے کردار ادھورے تھے کیونکہ دعا اور روشن مستقبل کی تمنا جو شاعر کے فن کا حاصل ہیں۔ مصنف کے کردار میں یکجا نظر آتے ہیں۔ یوں مصنف جو در حقیقت شاعر ہے نظم کے منظر نامے میں ناگزیر حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔

مصنف!۔۔۔"

جشن کا روز نیا روز ہے! رحمت ان پر
جن کے دل درد سے مغموم ہیں ان کے آنسو
کہکشاں چنتی ہے اور راہ کے قیدی ان سے
(اپنی منزل کا پتا پاتے ہیں۔۔۔! سب پر بخشش"(16

ابی نمر "جیلانی کامران کی لکھی گئی نمائندہ اور ہر دلعزیز نظموں میں سے ایک ہے۔ یہ نظم 1955ء میں ایڈنبرا میں لکھی گئی جیلانی کامران کے بقول: میں اس نظم کی مدد سے" طرزِ اظہار کے اس لمبے سلسلے کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جس کی تلاش میں مجھے ذہنی طور پر یمن سے دریائے تاجو تک سفر کرنا پڑا۔(17) اس نظم کی اشاعت پر مختلف قسم کی آراء سامنے آئیں جن کے مطابق یہ کہا گیا کہ جیلانی کامران اردو شاعری میں عرب ازم کے قائل ہیں اور فارسی روایت کو ترک کر کے اس تاریخی سلسلے سے منسلک ہونا چاہتے ہیں جسے العرب للعرب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ یہ نظم پان اسلام ازم کی خواہش ہے اور جیلانی کامران (دراصل عربوں اور ابن عربی کا ذکر کر کے مسلمانوں کی تاریخی نشاۃ ثانیہ کو مذہبی رنگ دینا چاہتے ہیں۔ ان سب باتوں کے جواب میں جیلانی کامران کا کہنا تھا کہ:

میں اپنے آپ کو عربوں کی عظیم الشان علمی و شعری روایت میں شامل کر کے اپنے لیے کوئی اجنبیت"
(محسوس نہیں کرتا کیونکہ علم الشعر کی کہانی بغیر سرحدوں کے بیان ہوتی ہے۔۔۔"(18

ابی نمر "نظم کا نمائندہ کردار ہے جس کی صورت میں جیلانی کامران نے فلسفہء عشق اور حیات و کائنات کو یکجا کر دیا ہے۔ ابی نمر کسی شخص کا نام نہیں اور نہ ہی اس نام کا کوئی شاعر" معلوم تاریخ میں گزرا ہے۔ اسپینی زبان میں ایک قصہ بنام ابن عمر مشہور ہے۔ جس میں ابن عمر کی بہادری اور شجاعت کا تذکرہ ہے، اور یہ واقعہ غرناطہ کی شکست سے متعلق ہے۔ ابن عمر کا قصہ ان مختلف منظوم کہانیوں میں سے ایک ہے جن میں الحمرا کی تباہی پر لکھی ہوئی نظمیں بھی شامل ہیں۔ یہ نظمیں اور مسلمانوں کے اندلسی دور کی دیگر نظمیں ایسی ہیں جس سے ابی نمر کی تخلیقی وابستگی ممکن نہیں لیکن متاثر ہونے کا قوی امکان ہے۔ لیکن اس نظم کا زمانہ غرناطہ کی شکست سے بہت پہلے کا زمانہ ہے۔ جب عربوں کی فتوحات عروج پر تھیں اور فرانس و ہسپانیہ کی سرحدوں پر عربوں کو راج تھا۔ اس زمانے میں جب مغربی یورپ جنسی جذبے کے شعری تاثر سے ناآشنا تھا ابی نمر ایک ایسا شاعر ہے۔ جو جنوبی

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

فرانس کے کنوارے کھیتوں اور سفید لڑکیوں کے پس منظر میں مہذب عرب شہسواروں کو ان گیتوں کی یاد دلاتا ہے جسے اس نے یمن میں سنا تھا۔ یمن اپنے طور پر خوبصورت سہی مگر بلادِ غیر میں یمن کے گیتوں کی یاد یمن کو کئی گنا دلآویز بنا دیتی ہے۔

ابی نمر کا تذکرہ کرتے ہیں سب درخت"

کہتے ہیں اس کے گیت تھے فارس کے گل کدے

ابی نمر کو پھولوں کی سرخی عزیز تھی

عارض کو گلعذار وہ کہتا تھا رات دن

(مشہد کی بیٹیوں کے پسینے کو یاسمن۔"(19

ابی نمر کو یمن دل و جان سے بڑھ کر عزیز ہے کیونکہ وہاں اس کا قبلہ جاں "فاطمہ" رہتی ہے جبکہ دیارِ غیر میں کشور کشائی اور مفتوح سرزمینوں کے علاوہ دل بستگی کی کوئی شے میسر نہیں اور وہ لڑکیاں جو اجنبی سرزمین پر وسیع القلب عربوں کو میسر ہیں، وہ عشق کے اس قرینے سے ناواقف ہیں۔ جس میں اہل عرب طاق ہیں۔

میرے سفر کے رہنما، راہوں میں یوں تو لاکھ بار

کلیاں بھی ہیں ہزار رنگ، لیکن نہیں وہ آس پاس

(کس سے کہوں کہ اس دفعہ پھولوں کے دن عذاب ہیں۔(20

ابی نمر ایک حسن پرست اور عاشق مزاج شاعر ہے جسے حسن سے بے طرح لگاؤ ہے اور یہی لگاؤ اس کے گیتوں میں جذبہ و روح کی وہ تاثیر پیدا کرتا ہے۔ کہ اس کی آواز کے سحر میں اجنبی دیس کا ہر صاحب دل جکڑا جاتا ہے۔ یوں یمن کا یہ شاعر اجنبی سرزمین پہ بہت دن تک اجنبی نہیں رہتا بلکہ وہ تہذیبوں کے ملاپ کی علامت بن جاتا ہے۔ انسانیت سے محبت جو جیلانی کامران کا مسلک ہے نہایت واضح انداز میں سامنے آتا ہے اور یہ کردار مقامیت سے بلند ہو کر آفاقیت کا نمائندہ بن جاتا ہے۔ ابی نمر ایک طرف تو دو تہذیبوں کے سنگم اور محبت فاتح عالم کا استعارہ ہے تو دوسری طرف اردو شاعری کا رشتہ عربوں کی عظیم الشان علمی اور شعری روایت سے جوڑتا ہے جس کے احیا کی خواہش جیلانی کامران کی نظموں میں جابجا نظر آتی ہے۔ نظم میں انسانیت اور محبت کا نمائندہ ابی نمر حیات و کائنات کا مسافر اور زندگی کا استعارہ بن کر اترتا ہے جو حیات کی جفاکشی اور ستم ظریفی کو جگر داری سے سہتا ہے۔ یہاں زندگی حقائق کے کنج سے برآمد ہوتی ہے۔ جو کبھی خوشی ہے تو کبھی مسرت کبھی وصل ہے تو کبھی جدائی۔ اور "جدائی" وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد ان کا تمام جہانِ فن محوِ گردش ہے۔ اگر دیکھا جائے تو جدائی دراصل حقیقت سے بچھڑنے کا استعارہ ہے۔ اور کائنات کا تمام چکر اور زمین و زماں کی تمام گردش فقط حقیقت تک پہنچنے کی جستجو ہے۔ ابی نمر کا محور بھی جدائی ہے۔ پہلے عارضی جدائی اور پھر دائمی جدائی فاطمہ زمین کی رونق تھی جو اس سے جدا ہو گئی اس کی جدائی میں ابی نمر ہی نہیں سارا عالم سوگوار ہے۔ یوں فاطمہ دنیا میں مرکز حسن و عشق بن کر ابی نمر ہی نہیں زمانے کا بھی دل دھڑکاتی ہے۔ یوں محبوبہ کی جدائی میں ابی نمر کا دل ہی پارہ پارہ نہیں بلکہ یہ دنیا بھی فقدان محبت سے بے حال ہے۔ ایسے میں ابی نمر کا انفرادی کرب اجتماعی دکھ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

کلیوں کو اپنے ہاتھ سے چنتے ہوئے بہار

کہتی ہے، فاطمہ کو پکارو! گزر کرے

دنیا بہت دنوں سے کسی کربلا میں ہے

کہتے ہیں، اب زمین کی رخصت طویل ہے

(اور فاطمہ کے واسطے دنیا علیل ہے۔(21

فاطمہ کے بعد ابی نمر بھی مر چکا ہے مگر اس کے گیت زندہ ہیں جو اس کی جذباتی اور شعری وارفتگی کے علمبردار ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ابی نمر ہی وہ اولین فنکار تھا جس نے یورپ کی گونگی بہری سرزمینوں کو جذبوں اور نغموں کی حدت عطا کی۔ چنانچہ ابی نمر کا کردار فقط مقامی یا لمحاتی کردار نہیں رہتا بلکہ وہ شعری رشتہ بن جاتا ہے۔ جو مشرق وسطیٰ کو مغربی یورپ سے منسلک کرتا ہے اور اس روایت کی داغ بیل ڈالتا ہے، جس سے یورپ کی عشقیہ اور صوفیانہ نظم پیدا ہوئی۔

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

تہذیبوں کے عروج وزوال اور ملاپ کی عکاسی کرتے دوسرے کردار "ہندوستانی درویش اور عراقی" ہیں۔ ابی نمر جہاں دو تہذیبوں کے سنگم کا استعارہ ہے وہیں درویش آریہ دیس کی جمنا سے ختن دریا تک اور شرشن سے بڑے فارس تک کے تغیر و تبدل کا آئینہ ہے۔ اس کردار میں ماضی کی مسافرت کا قصہ بھی موجود ہے اور سربلندی کی اٹھان بھی، لشکروں کی یلغاروں و دھمک بھی اور ٹھکانے کی تمنا بھی، مگر مستقل ٹھکانے کی جستجو نہیں کیونکہ زندگی جہد مسلسل کا نام ہے۔ رقص کا محور زمانوں پہ محیط ہے جو شرق و غرب اور شمال و جنوب کے فاصلوں کو سمیٹ لیتا ہے۔ اور رقص جو در حقیقت، جستجو، جینے کی کوشش اضطراب اور دیوانگی کا اشارہ ہے یہاں تہذیبی سفر کی جستجو میں مہمیز کا کام دیتا ہے۔ چنانچہ تہذیبی جڑوں کی شناخت کے اس سفر میں دونوں کردار محور رقص ہیں۔

ہم نے آپس میں کہا۔۔۔اس غم کو،"
کہ زمیں موت سے مجبور ہے کل کے دن تک
کیوں فراموش کریں، رقص! کسی نے ہم سے
یہ کہا۔۔۔رقص کیا۔۔۔جیسے قضا کے آگے
"(عمر سب روز وہی رقص کیا کرتی ہے۔(۲۲

اس نظم کا منظر نامہ ان کرداروں کے حوالے سے نا صرف ہند اسلامی تہذیب بلکہ اس سے بھی قدیم تہذیبی وارثت جو مشرق وسطیٰ سے ہند تک آریہ تہذیب سے جڑی ہے واضح کرتا ہے۔ اس تہذیبی اسرار میں درویش انسانی تلاش و جستجو کا استعارہ ہے جبکہ اعراقی کی شخصیت ایک لحاظ سے آریہ تہذیب سے جڑنے کی کوشش ہے۔ یہاں ہندی اور عجمی تہذیبیں اپنی جڑوں کی جستجو میں ہیں۔ یہ جڑیں تو صدیوں پہ پھیلی ہیں۔ جن میں لمبے قد کی مغلائیوں، مخروطی خیام والے لشکروں اور خوں ریزیوں میں سینہ سپر شہ سواروں کے نقشے جابجا بکھرے ہیں۔ مگر حال کا منظر نامہ دھندلا ہے، شناخت گم ہو چکی ہے۔ نئی تہذیب اور دور جدید نے ماضی کے سارے رشتے محو کر دیے ہیں۔ ناتے کمزور پڑ رہے ہیں۔ ایسے میں دکھ اور بے شناختی کی بڑھتی یلغار میں ایک مجنونانہ رقص کی ضرورت ہے۔ جس کی ہر گردش حال کے بے ربط رشتوں کو ماضی کے عظیم سلسلوں سے منسلک کر سکے۔ ہند اسلامی کلچر اور عجمی اسلامی تہذیب کے نقوش اور عجمی اسلامی تہذیب کے احیا کی خواہش یہاں شدید تر نظر آتی ہے اور نظم کی مختلف جہات میں تہذیبی و سماجی جہت نمایاں تر ہے لیکن تہذیب پر زوال ہے اور سماج پر بھی اس زوال کے سائے گہرے سے گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ مگر نظم کا شاعر امید ور جا کا شاعر ہے چنانچہ گہری دھند سے بھی روشنی کی کرنیں اپنی راہ ڈھونڈ ہی لیتی ہیں۔ اس نظم میں ان دو کرداروں کے حوالے سے تہذیبی شناخت کی تکمیل بطور خواب میسر ہے در حقیقت نہیں۔ مگر دیکھنے اور ہونے کے فرق میں نمایاں ترشے امید اور روشن مستقبل کی آس ہے۔

اپنے مفہوم سے ناواقف ہے"
(اور میں کون ہوں ناواقف ہوں"(23

آج تو دور سے گزرا ہے، تو اب مشرق کے"
تیز دریا کے کبھی پاس ہے جس کو نقشے
سندھ کہتے ہیں وہاں ہے، راہیں
(منزلیں۔۔۔دور کے بازار۔۔۔پرانے مدفن۔"(24

جیلانی کامران کی مختصر نظموں کے کردار بھی اسلامی عجمی تہذیب کا خواب ہیں۔ جن کے پس منظر میں وہ تابناک ماضی چمکتا ہے جو عروج آدم خاکی کا مظہر تھا۔ اسلامی عجمی تہذیب کی یہ علامات جابجا ان کی نظموں میں نظر آتی ہیں۔ تہذیب کے اس تصور سے وہ پاکستانی ادب کی تشکیل چاہتے تھے چنانچہ جہاں "استانزے" میں خدا سے کوئی رشتہ نظر نہیں آتا وہاں ان کی دیگر نظموں میں وہی پر انا مابعد الطبعیاتی نظام نظر آنے لگتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اسلامی تہذیب کو از سر نو ترتیب دینے کی خواہش مند ہیں۔ "پنج سورہ والا" اس کی واضح مثال ہے

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

جہاں آج سکول کے ہال کی"
کھڑکیاں ہیں وہاں اس کی آواز ہم سن کے
!مسرور ہوتے تھے قسمت سنوارو کتابیں خریدو
حمائل وظائف خریدو
(دعائیں خریدو۔"(25

یہ کردار ناصرف یادگار ہے بلکہ اس ماضی کا فسانہ ہے جہاں علم وحکمت کی سند اور سلطنت مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی۔ حکمت چونکہ مومن کی میراث ہے اس کی پیروی کی خاطر ماضی میں جہاں گردی اور فتوحات کا لامتناہی سلسلہ ہے جو آج فراموشی کی گرد میں خاک ہو رہا ہے اور موجود کا ہر لمحہ آشوبِ زیست میں گھرا ہے۔

اکیلے کا آشوب ظالم ہے اسکا ہمیں"
علم کب تھا کہ ہم اس کی آواز سن کر
اسے ڈھونڈتے
اس کی راہوں میں دن رات
بے چین رہتے اسے وہ کہانی سناتے
(جواب جانتے ہیں۔"(26

پنجسورے والے" کی صدا لمحہ ءحال میں اب زندگی کا حصہ نہیں رہی، یہ محض یاداشت ہے حقیقت نہیں۔ مگر شاعر اس یاد کو اپنی نجات کا ضامن جانتا ہے۔ اور اسی منزل کی طر" ف مراجعت کو مستحسن خیال کرتا ہے۔ جس کا محور و مرکز دیارِ نور "مدینہ" ہے۔

نظم "تماشا" کے دونوں کردار زمانہ ءحال کی زندگی میں آدمیت کے فریب اور بوالہوسی پر طنز کی صورت ہیں کہ یہ دنیا حق کے مقابل باطل اور صراطِ مستقیم کی بجائے فریب کاری پر مائل ہے۔ لوگ وقتی لذتوں اور خوشحالیوں کے لیے ناممکن کو ممکن کرنے پر تلے ہیں۔ چنانچہ نسل نو جو مستقبل کی امید ہے انہی شعبدہ بازیوں کو سیکھنے کی خواہاں ہے کہ جن سے لحاتی خوشیوں اور لذات کا حصول ممکن ہو سکے۔ آج علم منڈی کا مال ہے جس میں فائدے سے زیادہ خسارہ ہے۔ دنیا میں ہر معاملے میں سودا بازی ہوتی ہے۔ پانی پر چلنے کا فن اس سودے بازی کے لیے ہتھیار کا درجہ رکھتا ہے جو نہیں سیکھ پاتا وہ خسارے میں رہتا ہے اور نئی نسل خسارے پر راضی نہیں ہے۔

کتابوں کے بدلے"
اگر ہم سمندر کے پانی پر چلنے
کا انداز سیکھیں تو بہتر نہ ہو گا
(یہ بچے نے پوچھا۔"(27

چنانچہ نثر ادِ نو ماضی کی مردہ روایات واخلاقیات کو سنبھالنے کی روداد نہیں کیونکہ ایسے میں زمانہ انھیں روندتا ہوا آگے نکل جائے گا۔ ظاہر و باطن، نیکی و بدی اور اچھائی و برائی کی تخصیص قصہ ءپارینہ ہے۔ اب جو زمانہ ساز نہیں تنہائی، ذلت اور محرومی اس کا مقدر ہے۔ یہ وہ منظر نامہ ہے جو معاشرے کے اجتماعی زوال کا عکاس ہے۔ مگر شاعر جس کا فن امید ورجا کا پیغام ہے۔ وہ اس زوال میں بھی امید کو مرنے نہیں دیتا اور روشن مستقبل کے سہانے خواب آنکھوں میں سجائے قاری کے لیے تبدیلی کی آرزو کو زندہ رکھتا ہے۔ مگر "بچہ" جو مجموعی طور پر مستقبل اور نئی نسل کا نمائندہ ہے خواہش کے باوجود سمندر کے پانی پہ چلنے کا فن نہیں سیکھ پاتا تو خود کو خسارے میں پاتا ہے۔ اس کے لیے حیات لمحہ ءحال ہے اور کچھ نہیں سو اس لمحے کی رنگینی کے لیے مٹی کی سانجھ سے خلاصی لازم ہے۔ جو یہ نہیں کر پارہا وہ اپنے نصیب کو روتا ہے اور خود کو ناکام تصور کرتا ہے۔

وہ روتا رہا۔ کیوں کہ وہ مجھ سے کہتا تھا ہم کس لیے"
خشک مٹی پر چلتے ہیں جب لوگ

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

"(پانی پہ چلنے کی ترکیب سے آشنا ہیں۔(28

جیلانی کامران کی نظموں میں "بوڑھے استاد" کا کردار ماضی و حال و مستقبل کا وہی سنگم ہے جو ان کی بیشتر نظموں میں نظر آتا ہے۔ اس کردار کے ذریعے انھوں نے ماضی کی تہذیبی و علمی روایات کو حال کے مقابل لا کر اس فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے جو آج کی معاشرتی صورت حال کا شاخسانہ ہے۔ بکھرتی ہوئی اقدار، مٹتی ہوئی تہذیبی روایات، لٹتا ہوا مذہبی و اخلاقی سرمایہ بوڑھے استاد کی آنکھوں میں دھند کی صورت آن ٹھہرا ہے۔ جس سے حال کا منظر نامہ غیر واضح اور المناک ہو گیا ہے۔

ساری عمر کی محنت بن کر"

اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا

خشک زمیں پہ تیرا آنسو

بوڑھے باپ قیامت ہو گی

مت رو؟ عرش پہ نیک خدا کو

(روزِ حشر ندامت ہو گی۔"(29

استاد وہ سرچشمہ تھا جو جہل کی بنجر زمینوں کو اپنے خونِ جگر سے سینچ کر علم و حکمت کی فصل بوتا تھا مگر اب زمانے کے معیار بدل گئے ہیں۔ ایسے میں بوڑھا استاد ماضی کا وہ دفینہ ہے جسے لوگ فراموش کر چکے ہیں گو کہ حال کی رگوں میں اسی کا لہو دوڑ رہا ہے۔ اور اسی لیے شاعر نے ناامیدی اور انتشار کے ان لمحوں کو طویل ہونے نہیں دیا بلکہ اس بکھراؤ کو امید کے دستِ اماں سے سمیٹ لیا ہے۔

اس کالج کی خاک کے ذرے"

کل کو چاند ستارہ ہوں گے

کالی رات میں راہگیروں کو

آتے جاتے راہ بدلتے

(تیرے لفظ سہارا ہوں گے۔"(30

جیلانی کامران کے کرداروں میں ایک منفرد کردار "پاگل لڑکے" کا بھی ہے۔ یہ کردار دیوانگی میں فرزانگی کا استعارہ ہے جو ایک طرف تو حقیقی دنیا سے ماورا سچائی کے خواب دیکھتا ہے تو دوسری طرف معاشرتی بوالہوسی اور بوالعجبی پہ طنز کے نشتر چلاتا ہے کہ جہاں نظامِ حیات، اخلاقی اقدار، علم اور عالم سب کی حقیقت بدل چکی ہے۔

الو چیخے، پریاں دوڑیں، بچے بھاگے"

شہر کے اندر سرکس آیا،

بندر کوٹ کتاب اٹھائے

(دنیا بھر کی حکمت لایا۔"(31

پاگل لڑکا وہ سب کہہ ڈالتا ہے جو ہر صاحب بصیرت شخص کے سینے میں مدفون ہے۔ مستقبل اور ترقی کے خواب، اہلِ منصب کی نااہلی اور دنیا کے الٹے چکر کی حقیقت وہ اپنے قہقہوں میں کھولتا ہے۔ اسکی ہر بات ابن الوقت اور زر پرست زمانے کو چونکاتی ہے مگر دیوانے کی بڑ سمجھ کر ٹال دی جاتی ہے۔ یہ کردار جراتِ اظہار کی اس کمیابی پر طنز ہے جو راد گرد پھیلے معاشرے میں مفقود ہوتا چلا جا رہا ہے۔

ننھی بچی"، "زلیخا"، "طوطے والی لڑکی"، "انار کا پیڑ"، "ننھا غبارہ" جیسی کئی نظموں میں جیلانی کامران کے فن کا مرکز بچے یعنی نژادِ نو ہیں۔ ان کے فن میں بچوں کے کردار کا ظہور ایک معنی خیز اشارہ ہیں۔ جس سے ایک طرف تو وہ فلسفہء حیات و فن کی گتھیاں کھولتے ہیں۔ اور دوسری طرف رجائیت اور امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے یعنی وہ نژادِ نو

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

کے پردے میں ایک روشن مستقبل کی بشارت دیتے ہیں۔ وہ مستقبل کو حال کے پیمانے پر نہیں بلکہ ماضی اور ماضی بعید، یعنی انسان کے لاشعور میں پوشیدہ اس کے درخشاں ماضی کے حوالے سے روشن اور شاداب دیکھتے ہیں۔

زمیں سے فلک تک، فلک سے زمیں تک"
درختوں کے پتوں سے عرشِ بریں تک
میرا ملک ہو گا
(میری بات ہو گی۔"(32

یعنی جس روز انسان اپنی بے خبری کو جان لے گا اور غفلت کا پردہ چاک کر کے شعور کی دنیا میں قدم رکھے گا تو یہی شعور کی دنیا ہی دراصل وہ باغِ بہشت ہے، جہاں سے اسے حکم سفر ملا تھا۔ جب وہ اس منزل کو پالے گا تو گویا فرقت کا دور ختم ہو گا اور ایک بے انت وصال کا زمانہ پھر لوٹ آئے گا۔ مجموعی طور پر جیلانی کامران کی نظموں کے کردار انسان کو اس کے ماضی کی بھولی بسری کہانی یاد دلانا چاہتے ہیں جو موجود کی بربادی کو شادابی میں تبدیل کر دے۔ یہ کردار ظاہر کو باطن سے ہم رنگ کرنے کے خواہاں ہیں۔ ان کے سینوں میں تمنا کا وہ شعلہ ہے جو انھیں آمادہ سفر رکھتا ہے اور یہی تمنا ایک روشن اور تابناک مستقبل کی بشارت ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر ضیاء الحسن کہتے ہیں کہ: جیلانی کامران کی نظموں کے کردار بہت حیران کن حد تک متنوع ہیں۔ کردار سازی میں جیلانی کامران دیگر تمام شاعروں کی نسبت زیادہ مختلف ویژن رکھنے والے شاعر ہیں۔ اس ویژن کی تعمیر ان کی تصوف سے دلچسپی نے کی ہے جس کی وجہ سے وہ محبوب یعنی خدا اور اس سے تعلق رکھنے والی ہر شے کو ایک دھاگے میں پرو کر ایک کائناتی مالا ترتیب دیتے ہیں جس میں خدا، انسان، فرشتہ، پرندہ، تتلی، پھول، پتھر، درخت، ہوا، موسم، رنگ، بہار، زمین، ستارہ۔۔۔ ساری کائنات شامل ہے۔ انھوں نے انسان اور کائنات کے لیے روابط دریافت کیے ہیں (جو ان کی پہچان بن گئے۔(۳۳

جیلانی کامران کا فن اسلامی عجمی روایت سے مربوط ہے اور نظم نگاری میں واضح انداز میں یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ اسلامی نشاۃ ثانیہ کے خواہاں تھے۔ نئی شاعری کی تحریک سے وابستگی کے باوجود انھوں نے ماضی کو دفنانا گوارا نہیں کیا، اور نہ ہی مابعد الطبعیات اور مذہب کو بے معنی تصور کیا بلکہ انھوں نے اپنے فکر و فن اور کرداروں کے حوالے سے ماضی کو ایک نئے رنگ میں پیش کر کے اسے نئی صبح کا پیغام بنا دیا۔ ان کی شاعری نظریہ سازی کرتی ہے۔ اور یہ نظریات کرداروں کے حوالے سے راہ پاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو شاعری میں ان کا نام اعتماد، انفرادیت، علمیت، شعریت اور گہرائی کا حسین امتزاج ہے۔ ان کے فن کی سب سے نمایاں خصوصیت ثقافتی و مذہبی رواداری، اخلاقی اقدار، ماضی کی بازگشت اور سب سے بڑھ کر مسلمانوں کے تابناک ماضی کے احیا کی خواہش ہے جو ان کی نظموں کے کرداروں میں جابجا کروٹیں لیتی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری خواہش مرگ کو منہا کرتے ہوئے خواہش زیست کا باعث بنتی ہے اور موت کے راستوں سے زندگی کی طرف سفر کو تمنا، امید اور جستجو کے سہارے آسان تر کر دیتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی نظموں کا مرکز، حیات کے اس لمحے میں ہے کہ جہاں انسان اپنے ہونے سے باخبر ہوتا ہے تو غلط نہ ہو گا۔ ان کی نظموں کے کردار اس انسان کے متنوع روپ ہیں جو ظلم و جور، مایوسی و ناکامی، عبرت اور فنا کے ماحول میں زیست اور خواہش زیست کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ اردو نظم میں بلاشبہ ان کے کردار اپنی قوت، انفرادیت، بنت کاری اور پیش کش کے اعتبار سے عرصہ دراز تک زندہ رہنے کی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔ کیونکہ انھوں نے فقط نظموں کو کرداروں سے متحرک و مزین نہیں کیا بلکہ انسان اور انسانیت کی بقا و معراج کے خوابوں کو کرداری تعبیروں میں ڈھال کر ہر صاحبِ دل و صاحبِ شعور کو زیست اور راہِ زیست کے ہمسفر مہیا کرنے کی کوشش کی ہے۔ بطورِ نظم نگار اور فنکار ان کی فنی سچائی ہمیشہ زندہ اور تابندہ رہے گی۔

حوالہ جات

۱۔ جیلانی کامران، باقی نظمیں، (مرتب لطیف قریشی)، لاہور: ملٹی میڈیا افیئرز، 2009ء، دیباچہ، ص ۷
۲۔ ایضاً، ص ۹
۳۔ ایضاً، ص 10
۴۔ ایضاً، ص 10
۵۔ ایضاً، ص ۱۱

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.4 No.4 2021

۶۔جیلانی کامران، نقش کفِ پا، ایک لمبی نظم، لاہور: مکتبہ ادبِ جدید، جون 1962ء، ص ا
۷۔ایضاً، دیباچہ، نقش کفِ پا، ص 21-22
۸۔ڈاکٹر وحید قریشی، "جدیدیت کی تلاش میں"، لاہور: مقبول اکیڈمی، 1990ء، ص 28-29
۹۔جیلانی کامران، نقش کفِ پا، ایک لمبی نظم، ص ۳
۔ایضاً، ص ۱۰۳
۱۱۔وحید قریشی، ڈاکٹر، "جدیدیت کی تلاش میں"، ص 40
۔جیلانی کامران، نقش کفِ پا، ص 1213
۔ایضاً، ص 139
۔ایضاً، ص 1431
۔ایضاً، ص ۱۵۳۳
۔ایضاً، ص 1648
۔جیلانی کامران، "نئی نظم کے تقاضے"، (طرزِ اظہار کی تلاش: ابی نمر)، لاہور: مکتبہ عالیہ، دوسرا ایڈیشن 1985ء، ص 1759
۔ایضاً، ص ۱۸۷۷
۔جیلانی کامران، "استانزے"، لاہور: مکتبہ ادبِ جدید، 1959ء، ص ۱۹۵۵
۔جیلانی کامران، "نئی نظم کے تقاضے"، ابی نمر، دوسرا ایڈیشن 1985ء ص 2040
۔جیلانی کامران، "استانزے"، ابی نمر، ص 56-2158
۲۲۔ایضاً، ص 97
۔ایضاً، ص 2398
۔ایضاً۔ ص ۲۴۱۰۱
۔جیلانی کامران، دستاویز، لاہور: نیا ادارہ جولائی 1989ء، ص 2519
۔ایضاً، ص 2691
۔ایضاً، ص 2715
۔ایضاً، ص 2816
۔جیلانی کامران، فاروق حسن، چھوٹی بڑی نظمیں، لاہور: کتابیات، ستمبر 1967ء، ص 2932
۔ایضاً، ص ۳۰۳۳
۔ایضاً، ص 3156
۔ایضاً، ص 50-3251
۳۳۔جیلانی کامران، (مرتب: لطیف قریشی)، "باقی نظمیں"، دیباچہ، ص 19